

ابوظلمہ مختار اللہ حقانی \*

## رسول اللہ ﷺ سے بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھنے کی تحقیق

محترم جناب ایڈیٹر ماہنامہ ”الحق“ اکوڑہ خٹک۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

جناب! ماہنامہ الحق ستمبر ۲۰۰۴ء جلد نمبر ۳۹ ص ۳۴ میں درج ہے کہ نبی کریم صلعم نے بغض نفیس ۲۰ رکعات تراویح کی نماز ادا فرمائی ہے..... حالانکہ علمائے احناف اس کے خلاف فرماتے ہیں۔

۱۔ امام ابوحنیفہ: آپ ﷺ نماز عشاء سے لے کر نماز فجر تک آٹھ رکعت اور تین و تر پڑھتے تھے (کتاب الآثار

ص ۲۶) ۲۔ امام محمد تمیزی ابوحنیفہ: رسول اللہ رمضان میں یا اس کے علاوہ گیارہ رکعات پر اضافہ نہیں کرتے تھے

(موطاء امام محمد مترجم ص ۱۲۲) ۳۔ امام ابن ہمام حنفی: ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔ تراویح کی مسنون

تعداد گیارہ رکعات ہے (ص ۶۰ ج ۱) ۴۔ علامہ بدر الدین عینی: (عمدہ القاری ص ۱۷۷ ج ۱)

۵۔ ملا علی قاری حنفی: (مرقاۃ المفاتیح ص ۱۹۶ ج ۱) ۶۔ مولانا عبدالحی لکھنوی: (العلیق المجد ص ۱۶۱)

۷۔ انور شاہ کاشمیری (العرف الخدی ص ۱۶۶ ج ۱) ۸۔ جلال الدین سیوطی: (المصابیح فی رکعات

التراویح ص ۱۶) ۹۔ عبدالحق دہلوی: (ماثبت بالنسب ص ۲۱۷)

۱۰۔ قاضی شمس الدین (القول الفصح ص ۵) ۱۱۔ طحاوی شرح درمختار جلد نمبر ۱ ص ۲۹۵ ان

النبی ﷺ لم یصلہا عشرين بل ثمانیا ۱۲۔ ابوالسعود شرح کنز الدقائق ص ۱۶۵ ج ۱ مصری

لأن النبی ﷺ لم یصل عشرين بل ثمانیا۔ ۱۳۔ الشیخ عبدالحق دہلوی اپنی کتاب

”فتح السمان فی تائید مذہب النعمان“ کے صفحہ نمبر ۳۲ میں لکھتے ہیں۔ ولم یثبت رواية عشرين منه

ﷺ كما هو المتعارف: (مرویہ ۲۰ رکعت نبی ﷺ سے ثابت نہیں.....) تو جناب آپ کے پاس کوئی نص ہے

توبندہ کی رہنمائی فرمائیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ۲۰ رکعت تراویح ادا کی ہے۔ امید ہے ضرور جواب دیں گے۔

دعا گو عبید الرحمن یزدانی (لابریرین)

اشرف لیبارٹیز پرائیویٹ لمیٹڈ، سرگودھا روڈ یوسف چوک فیصل آباد

باسمہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق

محترم المقام جناب عبید الرحمن یزدانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! بعد از سلام مسنون امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں گے۔ آنجناب کا والد نامہ بتاریخ ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۴ء بمطابق ۴ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ کو موصول ہوا پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آنجناب نے احقر (راقم الحروف) کے مضمون کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور پھر ایک مقام (آنحضرت ﷺ) نے خود نفس نفس میں رکعت تراویح پڑھی ہے) کے اصل ماخذ کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی۔ اور اس روایت کو رد کرنے کے لئے چند اقوال اور بعض کتابوں کے حوالجات بھی تحریر فرمائی ہے۔ مکتوب ارسال کرنے کا بہت شکریہ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ جواب حاضر خدمت ہے مگر مصروفیات و مشاغل کی وجہ سے تاخیر کے لئے معذرت خواں ہوں۔

آنجناب نے جس حدیث کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے وہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۴/۲ اور سنن بیہقی ۴۹۶/۲ باب ماروی فی عدد رکعات الصیام فی شہر رمضان میں مذکور ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں: حدثنا یزید بن ہارون اخبرنا ابراہیم بن عثمان عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ كان يصلي في رمضان عشرين ركعة والوتر (مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۴/۲) اور سنن بیہقی میں یصلی فی رمضان بغير جماعة عشرين ركعة الوتر کے الفاظ سے مذکور ہے۔

اسی طرح اس روایت کو عبد بن حمید نے مسند عبد بن حمید میں علامہ بغوی نے اپنی معجم میں اور امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے (العلیق الحسن علی آثار السنن ۲۵۴ و اعلیٰ السنن ۸۲/۷) مگر عموماً اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں، اور گمان غالب ہے کہ آنجناب نے بھی اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں درج شدہ مفہوم حدیث کے اصل ماخذ کی وضاحت طلب کرنے کے لئے مکتوب ارسال فرمایا، اور یہ بات قرین قیاس ہے اس لئے کہ جب کسی کو اس مسئلہ کے بارے میں اتنی کتابوں کا علم ہو تو اس کو اس روایت کا اصل ماخذ کیسے معلوم نہ ہوگا، لازماً اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں یہ روایت انوکھی لگی، مگر اس اعتراض کی

حقیقت اور جواب سے قبل چند مقدمات کو ذہن نشین کرنا نہایت ہی ضروری ہے، جب ہی اشکال و اعتراض کی حقیقت معلوم ہوگی اور جواب سمجھ میں آئے گا۔

(۱) مقدمہ اولیٰ: کسی حدیث کے قابل عمل ہونے کے لئے صرف اس حدیث کی سند کا صحیح ہونا ضروری نہیں یہ اس لئے کہ اگر اس شرط کو ضروری قرار دیا جائے تو پھر بہت ساری احادیث کا ترک کرنا لازم آئے گا حالانکہ ان احادیث مبارکہ کو باوجود سند کے اعتبار سے غیر صحیح ہونے کے فقہاء کرام اور محدثین عظام نے معمول بہ بنائے ہیں۔ اور اسی پر عمل کر کے چلے آ رہے ہیں۔ مثلاً (۱) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ لا وصیۃ لیسورث (الحدیث) کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ اس بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو اہل حدیث ثابت نہیں کہتے۔ لیکن عامہ علماء نے اس کو قبول کر لیا ہے۔ اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک انہوں نے اس حدیث کو آیت وصیت کا ناخ قرار دیا ہے۔

(۲) اسی طرح العینان و کاء المسہ (الحدیث) آنکھیں سرین کے تسے ہیں۔ یہ روایت بھی سنداً ضعیف ہے مگر اس کے باوجود بعض محدثین اور فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ المساء طہور لاینجسہ شئی الاما غلب علی ریحہ او طعمہ (الحدیث) کے بارے میں امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر علماء امت کا اتفاق ہے، مگر اس کے باوجود اہل مدینہ اور دوسرے فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۴) اسی طرح کہ من جمع بین الصلاتین من غیر عذر فقد اتی باباً من ابواب الکبائر (ترمذی ۳۰۳/۱) اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: قال ابو عینی حنث هذا هو ابو علی الرحبی وهو حسین بن قیس وهو ضعيف عند اهل الحديث ضعف احمد وغيره لیکن اس کے باوجود والعمل علی هذا عند اهل العلم ان لا یجمع بین الصلاتین الا فی السفر او يعرفه (الجامع الترمذی ۳۰۳/۱)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: حنث یہ یوعلی الرحبی ہے اور اس کا نام حسین بن قیس ہے اور یہ راوی محدثین کے ہاں ضعیف ہے امام احمد اور دوسرے ائمہ جرح و تعدیل نے اس کی تضعیف کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اہل علم کا اس پر عمل ہے اور ان کے ہاں سفر اور عرفہ کے علاوہ جمع بین الصلاتین جائز نہیں۔

(۶) اسی طرح کہ طلاق الامۃ ثنتان وعدتها حیضتان (الحدیث) اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث غریب والعمل علیہ عند اهل العلم من اصحاب رسول اللہ ﷺ وغیرہم ترمذی اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ قال قاسم و سالم عمل به المسلمون

وقال مالك شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سندہ (۴۴۱/۲)

یہ حدیث غریب ہے اور اس پر آنحضرت ﷺ کے اہل علم صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کا عمل ہے، امام قاسم اور امام سالم کہتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ میں کسی حدیث کی شہرت سند کی صحت سے مستغنی کر دیتی ہے۔

اسی طرح امام ترمذیؒ نے کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے مگر اس پر اہل علم کا عمل ہے۔ اور آج تک ان پر عمل چلا آ رہا ہے۔

## (2) مقدمہ ثانیہ:

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث مبارک سند کی وجہ سے درجہ صحت اور درجہ حسن تک پہنچتا ہے تو اسی طرح امت مسلمہ کے تلقی بالقبول سے بھی وہ روایت باوجود سنداً ضعیف ہونے کے درجہ صحت و حسن کا مقام پالیتا ہے اسی لئے محدثین عظام نے فرمایا ہے: قال بعضهم يحكم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح (تذریب الراوی ۱/۶۷) بعض نے کہا ہے کہ حدیث پر صحیح کا حکم اس وقت بھی لگایا جائے گا۔ جب امت اس کو قبول کرے اگرچہ اس کی سند ضعیف ہو۔

اور اسی وجہ سے محقق ابن حاتمؒ نے فتح القدیر (۴۶۱) میں فرمایا ہے کہ اذا تأيد الضعيف بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحا کہ جب کسی ضعیف روایت کی صحت پر قرآن شرع وال ہوں تو وہ حدیث صحیح ہے۔

اور اسی بناء پر محدثین اور فقہاء نے کافی سارے ذخیرہ احادیث کو صحیح کہا ہے اور ان کو معمول بہا قرار دیا ہے۔

(۱) مثلاً الاستاذ کارمیل علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ لما حكى عن الترمذی ان

البخاری صحح حديث البحر هو الطهور ماؤه و اهل الحديث لا يصحون مثل اسنادہ لكن الحديث عندي صحيح لان العلماء تلقوه بالقبول (بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن ۶۱/۱-۶۵) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ البحر هو الطهور ماءہ کو صحیح فرماتے ہیں اور دوسرے محدثین اس روایت کو سند کی وجہ سے صحیح نہیں کہتے مگر میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے اس لئے کہ علماء نے اس روایت کو قبول کیا ہے

۲۔ اسی طرح علامہ محقق ابن حاتمؒ - قول الترمذی (و العمل عليه عند اهل علم) يقتضى

قوة أصله و ان ضعف خصوص من هذه الطريق (فتح القدیر ۱/۲۱۷) کہ امام ترمذیؒ کا قول کہ اہل علم کے ہاں اس روایت پر عمل سے اس روایت کے اصل کی قوت (صحت) کا تقاضہ کرتا ہے اگرچہ انہوں نے سند کی

وجہ سے اس کو ضعیف کہا ہو۔

اور کتاب الطلاق کے فصل اول میں لکھا ہے ومما یصح الحدیث ایضاً عمل العلماء علی وفقہ وقال الترمذی عقیب روایۃ حدیث طلاق الامۃ ثنتان ..... حدیث غریب والعمل

علیہ عند اهل العلم من أصحاب رسول الله ﷺ وغيرهم (فتح القدیر ۳/۱۳۳)

علماء کا عمل بھی ان امور میں سے ہے جس کی وجہ سے حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے امام ترمذی نے طلاق الامۃ ثنتان وعدتھا حیضتان کے بعد فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے مگر صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کے ہاں اس پر عمل ہے۔

۳۔ اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے تعقبات میں ایک اور مثال ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وقال الترمذی

قدرأی ابن المبارک وغیرہ صلوۃ المستبیح وذکروا الفضل فیہ قال البیہقی فان عبد اللہ بن المبارک یصلیہا وتداولہ الصالحون بعضهم عن بعض وذک تقویۃ للحدیث المرفوع (مقدمہ اعلاء السنن ۶۲/۱) ”کہ عبداللہ بن مبارک اور دوسرے اہل علم نے صلوۃ تسبیح کی ترغیب دی ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک صلوۃ تسبیح پڑھا کرتے تھے اور صالحین کے ہاں یہ نماز چلی آرہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس حدیث مرفوع کو تقویت ملی۔“

یہ چند روایات بطور نمونہ ذکر کئے گئے ورنہ اور بھی کافی ساری روایات ذخیرہ حدیث میں موجود ہیں۔ جو سنداً ضعیف ہیں مگر تلقی بالقبول کی وجہ سے علماء نے ان کو صحیح کہا ہے۔ تلقی الامۃ بالقبول ایسی دلیل صحت ہے کہ کبھی کبھی خبر تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے تواتر کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ نے احکام القرآن میں لکھا ہے۔ وقد استعملت الامۃ ہذین الحدیثین وان کان ورودہ من طریق الاحاد فصار فی خیز التواتر لان ما تلقاه الناس من اخبار الاحاد بالقبول فہو عندنا فی معنی التواتر (۱/۳۸۶ بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن ۶۲/۱)

ان دونوں احادیث کو امت نے معمول بھانپا ہے اگرچہ ان کا ورود بطریق الاحاد ہو چکا ہے مگر اس تعامل سے یہ روایات تواتر کے حکم میں داخل ہوئے اس لئے کہ لوگوں کا اخبار احاد کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ہمارے ہاں تواتر کے معنی میں ہے۔ تلقی الامۃ بالقبول سے حدیث ضعیف کا قابل احتجاج ہونے کا اصول علامہ صدیق بن حسن القنوجی نے الروضۃ النندیۃ ۶/۱ میں بھی لکھا ہے۔

(3) مقدمہ ثالثہ: تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث صحت سند اور تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے

صحت اور حسن کا مرتبہ پاتا ہے تو اسی طرح دوسرے قرآن شرع، مثلاً اجماع امت، شواہد اور توابع وغیرہ کی وجہ سے بھی

ضعف روایت صحت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اس لئے علامہ ابوالحسن بن المحصار المالکیؒ نے تقریب المدارک علی مؤطا مالک میں لکھا ہے: قد یعلم الفقہ صحتہ الحدیث اذا لم یکن فی سندہ کذاب بموافقة آیت من کتاب اللہ او بعض اصول الشریعة فیحملہ ذلک علی قبولہ والعمل بہ (تدریب الراوی ۱/۶۸) کبھی فقہ کی حدیث کی صحت کو صرف اس وجہ سے جان لیتا ہے کہ وہ روایت قرآنی آیت یا اصول شرعیہ کے موافق ہے اور وہ اس روایت کو قبول کر کے اس پر عمل کر لیتا ہے بشرطیکہ اس روایت کی سند میں کوئی کذاب راوی نہ ہو۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے اپنے استاد حافظ عزرائقی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان یتفق العلماء علی العمل بمدلول حدیث فانہ یقبل حتی یجب العمل بہ (بحوالہ التعليقات المحافضة علی الاجویۃ الفاضلۃ ص ۲۳۱)

علماء امت مدلول حدیث پر عمل کرنے پر متفق ہیں اور اس کو قبول کرتے ہیں حتیٰ کہ اس پر عمل کرنے کو واجب اور ضروری سمجھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ روایت اصول شرع کے موافق ہو اگرچہ اسکی سند میں کوئی کمزوری ہو تب بھی وہ روایت ان کے ہاں معمول بھا ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے محقق بن ہاشمؒ نے لکھا ہے کہ فان ضعف الاسناد غیر قاطع ببطلان المتن بل ظاہر فیہ فاذا تأیّد بما یدل علی صحته من القرائن کان صحیحاً (فتح القدیر ۲/۸۷) سند کا ضعیف ہونا متن کے بطلان کی دلیل نہیں بلکہ اس میں ظاہر ہے کہ جب اس صحت پر قرآن شرع میں سے کوئی قرینہ دالت کرے تو وہ روایت صحیح کہلاتی ہے۔

(4)۔ مقدمہ رابعہ: چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ کسی بھی حدیث کو قطعی طور پر اس وقت تک ضعیف اور غیر معمول بھا نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: واذا قیل هذا حدیث صحیح فهذا معناه ای ما اتصل سندہ مع الاوصاف المذكورة فقبلنا عملاً بظاہر الاسناد لانه مقطوع به فی نفس الامر لجواز الخطاء والنسيان عن الثقة واذا قیل هذا حدیث غیر صحیح (ضعیف) فمعناه لم یصح إسناده علی الشرط المذكور لانه کذب فی نفس الامر لجواز صدق الکاذب واصابة من هو کثیر الخطاء (تدریب الراوی، بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن/ ۵۶)

جب یہ کہا جائے کہ یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ روایت ہے جس کی سند صفات مذکورہ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے تو ہم اس کو ظاہر سند کی وجہ سے قبول کرتے ہیں لیکن اس کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ نفس الامر میں بھی یہ روایت صحیح ہے اسلئے کہ ثقہ راوی سے بھی خطا اور نسیان کا احتمال ہے اور جب کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی سند مذکورہ شرائط کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچا لیکن اس کا یہ مقصد

ہرگز نہیں کہ نفس الامر میں بھی یہ جھوٹ ہے اسلئے کہ جھوٹے سے بھی سچ اور اصابت رائے کی توقع کی جاسکتی ہے۔  
یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ضعیف حدیث بھی صحیح بہ بن جاتا ہے جب اس کی صحت پر کوئی قریبہ دلالت کرے اور  
جب قرآن اس کے خلاف ہو تو صحیح حدیث پر بھی عمل ترک کیا جاتا ہے (اعلاء السنن/۵۶)

لہذا اب ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس روایت پر ضعف کا جواب اعتراض کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں  
کہ یہ روایت سنداً ضعیف ہے اس لئے کہ اس روایت کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العباسی ہے اور اس کو محدثین  
نے ضعیف کہا ہے چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں۔ تفرّدہ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان العباسی وھو  
ضعیف کہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان عیسی اس روایت میں مفرد ہے۔ اور وہ ضعیف ہے (السنن الکبریٰ ۲/۴۹۶)

شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ العباسی الکوفی قاض  
بو اسط وجد ابی بکر بن ابی شیبہ مروی عن زوج امہ الحکم بن عتیبہ وغیرہ  
کذبہ شعبۃ للکونہ روى عن الحکم عن ابن ابی لیلیٰ انه قال شہد صفین  
من اهل بدر سبعون فقال شعبۃ کذب واللہ لقد ذاکرت الحکم فما وجدنا  
شہد صفین۔ احداً من اهل بدر غیر حزیمة:

قلت سبحان اللہ! اما شہدھا علی! اما شہدھا عمارؓ روى۔ عثمانؓ  
لا ادری عن ابن معین! لیس بثقة وقال احمد ضعف وقال البخاری سکتو  
عنه وقال النسائی متروک الحدیث ..... الخ (میزان الاعتدال ۱/۴۸)

ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العباسی الکوفی واسط کا قاضی ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ کے دادا آپ نے اپنی ماں کے شوہر حکم بن  
عتیبہ وغیرہ سے روایت کی۔ امام شعبہ نے آپ کی تکذیب اس وجہ سے کی ہے کہ آپ نے حکم بن عتبہ عن ابن ابی لیلیٰ کی  
سند سے ذکر کیا ہے کہ جنگ صفین میں ۷۰ بدری صحابہ شریک ہوئے تھے امام شعبہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے میں نے  
خود حکم بن عتبہ سے اسکا ذکر کیا تو انہوں نے حضرت خزیمہؓ کے علاوہ کسی بدری صحابی کا صفین میں شرکت کا ذکر نہیں کیا۔  
علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ کیا حضرت علیؓ بھی شریک نہیں ہوئے تھے اور حضرت عمارؓ نے بھی  
شرکت نہیں کی تھی عثمان داری نے امام ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابوشیبہ ثقہ نہیں ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ابوشیبہ  
ضعیف راوی ہے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ابوشیبہ سے خاموش ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ ابوشیبہ متروک  
الحدیث راوی ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جس کی وجہ سے بعض حضرات اس کی اصلیت سے انکار کر بیٹھے۔

مگر اس اعتراض کے جواب کے بارے میں علامہ محمد حسن فیض پوریؒ رسالہ تحفۃ الاخوان فی صلوة رمضان میں لکھتے ہیں  
(الجواب) اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اہل حدیث نے اسکو مجروح اور ضعف کہا ہے اور اس کے ضعف پر

اصرار کیا ہے مگر اس عاجز بیچہ ماں کے نزدیک یہ تمام جروحات خام اور غیر موثر ہیں اور افسوس صد افسوس ان اہل علم پر جن سے یہ حرکت سرزد ہوئی اور کسی نے مخالف اور موافق سے غور اور تامل نہ کیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چند اسباب جرح کے متعدد اور متکثر ہیں مگر مال اور انجام کار ان سب کا دوام پر ہے۔ اول جرح باعتبار عدالت اور تقویٰ کے اور دوسری جرح باعتبار حفظ اور ضبط کے اور میرے ناقص فہم میں ان محدثین کے جروحات سب کے سب عدالت کی طرف رائج ہیں حفظ اور ضبط کی طرف نہیں کیونکہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کے ۷۱ صفحہ ۶۸ میں اسکو حافظ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اس کی عبارت یہ ہے: ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ الحافظ انتہی لہذا جب اس کے بارے میں لفظ حافظ مسلم ہوا تو اب باقی جروحات ان اہل حدیث کے سب عدالت کی طرف رائج ہے جبکہ یہی امر محمد متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ جرح باعتبار عدالت کے بھی اس کے حق میں خام اور غیر موثر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جن اہل علم نے عدالت کے رو سے اس کو متروک اور ضعیف کہا ہے تو وہ سب جروحات مبہم اور غیر مفسر ہیں اور مداران سب کا مفسر طور پر فقط ایک ہی جرح پر ہے وہ یہ کہ ان میں سے شعبہ بن حجاج نے سب سے مقدم اور بین السبب جرح فرمائی ہے یعنی جو کہ شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے لکھی ہے 'وہو قولہ کذبہ شعبۃ لکونہ روی عن الحکم عن ابن ابی لیلیٰ' انہ قال شہد صفین من اہل بدر سبعون فقال شعبۃ کذب واللہ لقد ذاکرت الحکم فما وجدنا شہد صفین من اہل بدر غیر حزیمة اور باقی محدثین شعبہ کے متبع اور مقلد ہیں اور سب کے سب اس کے بعد ہیں کوئی جارج ابو شیبہ کا معاصر نہیں بجز شعبہ کے تو جروحات عدالت کا مدار شعبہ کی کلام پر رہا جب یہی امر محمد متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ یہ جرح اگرچہ مفسر اور بین السبب ہے مگر اس قدر کی جرح سے ابو شیبہ متروک قرار دینا اور من کل الوجوہ ضعیف کہنا غلط اور بے انصافی ہے کیونکہ اس قسم کی جرح از قبیل سہو اور نسیان ہے اور وہ چنداں خارج نہیں ورنہ ابن حجاج بلکہ خود حکم بن عتیہ کذاب اور متروک قرار دیا جاوے گا کیونکہ ان سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے اس لئے شعبہ اور حکم اس بات کے قائل ہیں کہ صفین میں بجز حزیمة کے اہل بدر میں سے کوئی معاصر نہ تھا حالانکہ حضرت علیؑ اور حضرت عمارؓ دونوں صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے اس واسطے شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے شعبہ کے جواب میں کہا کہ سبحان اللہ اما شہدا علیٰ اما شہدا عمارؓ انتہی 'اب اگر اس قدر سہو اور ذہول کے سبب ابو شیبہ متروک قرار دیا جائے تو چاہیے کہ شعبہ بن حجاج اور حکم بن عتیہ بھی متروک قرار دے جاوے للعلل الواحدة الجامعة فیہم وہی عدم حفظ اصحاب بدر' اب شعبہ بن حجاج کو امیر المؤمنین قرار دینا اور حکم بن عتیہ کو اجماعی امام ثقہ کہنا اور ابو شیبہ کو ضعیف قرار دینا مع اتحاد سبب الجرح فیہم انصاف سے بعید ہے اور میں کہتا ہوں کہ ابو شیبہ کی بہ نسبت شعبہ اور اسکے شیخ حکم بن عتیہ کی غلطی سخت ہے اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان امام میں بہت سارے بدری صحابہ کرامؓ زندہ تھے۔

منہم رفاعۃ بن رافع مات فی اول خلافة معاویہ، ابولبابۃ الانصاری عاش الی خلافة علی، ابوطلحہ الانصاری مات سنة اربع و ثلاثین وقال ابو زرعة عاش بعد النبی ﷺ اربعین سنة، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل مات سنة خمیسین او بعدها، سهل بن حنیف مات فی خلافة علی، عبد اللہ بن مسعود مات سنة اثنین و ثلاثین، ابو مسعود البدری مات قبل الاربعین، عبادۃ بن الصامت مات سنة ثلاثین، عتب بن مالک مات فی خلافة معاویہ، مالک بن ربیعۃ ابو السید مات سنة ثلاثین او بعدها ابیہ تمام صحابہ اور ان کے سوا دوسرے بدری صحابہ زندہ تھے کل ذلک من التقرب،

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نسبت اور بدریوں کے حضرت علیؑ اور حضرت عمارؓ کا صفین میں ہونا اظہر من الشمس تھا اور ہر فرد بشر ادنیٰ اور اعلیٰ ذی علم میں سے اس بات کا خوب واقف ہے اور شعبہ اور حکم ان سے بھی غافل ہیں اب باوجود ایسی سخت غلطی کے جب شعبہ اور حکم مجروح نہیں تو ابوشیبہ بھی مجروح نہ ہوا وہو المطلوب اسی واسطے خاتم المحدثین اور ہمارے پیران پیر اور شیخ شیخ الشیخ نے اعلیٰ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے رسالہ تراویح میں لکھتے ہیں کہ حالانکہ ابوشیبہ ان قدر ضعیف ندارد کہ روایت او مطروح ساختہ شود اور میں کہتا ہوں کہ یہ بات خاتم المحدثین کی راست اور درست ہے (رسائل ستہ ضروریہ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲)

اور میں کہتا ہوں کہ علامہ فیض پوریؒ کا یہ کلام قرین قیاس ہے اس لئے کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کو مجروح ثابت کرنے میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ امام ابن عدیؒ آپ کے متعلق فرماتے ہیں نہ احادیث صالحہ وھو خیر من ابراہیم بن ابی حنیہ (تہذیب التہذیب ۱/۱۳۵) اسی طرح امام بخاریؒ کے استاد الاستاذ یزید بن ہارون جو نہایت ثقہ اور اعلیٰ درجہ کے حافظ حدیث ہیں۔ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کے بڑے مداح تھے آپ فرمایا کرتے تھے ما قضی علی الناس یعنی فی زمانہ اعدل فی قضاء منہ (تہذیب التہذیب ۱/۱۳۵)

یعنی ہمارے زمانے میں ان سے زیادہ عادل کوئی قاضی نہیں تھا۔ یہاں یہ بات گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید بن ہارون سے بڑھ کر ابراہیم بن عثمان کا پرکھنے والا اور ان کے حالات سے باخبران جارحین میں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یزید بن ہارون ان کے محکمہ میں کاتب یعنی ان کے منشی تھے۔ وہ ابوشیبہؒ کی عدالت، تقویٰ، للہیت سے خوب واقف تھے۔ اس لئے یزید کی شہادت ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے علم اور دیانت داری دونوں میں زبردست شہادت ہے۔ اور ویسے بھی کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لئے دو باتیں لازمی طور پر دیکھی جاتی ہیں

ایک تدین (دینداری) دوم اس کا قوت حافظہ یزید بن ہارون کی شہادت کے بعد اب تو ابراہیم بن عثمان کے تدین میں تو کوئی شک باقی نہیں رہا۔ اور حافظ ابن حجرؒ اور ابن عدیؒ کی شہادت سے اس کا حافظہ بھی معلوم ہوا۔ ان دونوں امور کے ثابت ہونے کے بعد اس کو اس حد تک ضعیف قرار دینا جس کی وجہ سے اس کی روایت کردہ حدیث کو ناقابل استدلال قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ امام شعبہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ ثقہ راویوں سے روایت لیتے تھے اور تہذیب العہد یب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوشیبہ سے امام شعبہ نے روایت لیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ نے اپنی جرح سے رجوع کر لیا ہوگا اب اگر شعبہ کے رجوع کو مان لیا جائے تو راوی ابوشیبہ ثقہ ہو اور اگر رجوع ثابت نہ مانا جائے تو راوی مختلف فیہ ہوا جس کی وجہ سے وہ درجہ حسن میں آئے گا اور درجہ حسن کی روایت بھی قابل احتجاج ہے اس لئے یہ روایت صرف شعبہ کے جرح سے ناقابل استدلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بالفرض ان حضرات کی جرح کو مان لیا جائے اور ان کی وجہ سے ابراہیم بن عثمان کو ضعیف قرار دیا تو صرف اس سے روایت کو ضعیف نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ اس کی تائید میں عہد فاروقی کے مسلمانوں کا علانیہ عمل اور ائمہ مجتہدین کے اتفاق رائے جیسے قوی اور ٹھوس دلائل موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ روایت قابل احتجاج ہے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے خود ایک موقع پر اعتراف کیا ہے کہ بعض ضعیف ایسے ہیں جو امت کی تلقین بالقبول سے رفع ہو گئے ہیں (اخبار اہل حدیث مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۰۷ء بحوالہ بیس تراویح کا ثبوت ص ۴)

غیر مقلدین کی نا انصافی: تلقی بالقبول پر مزید تفصیلی بحث کرنے سے قبل حضرات غیر مقلدین کی نا انصافی بتانا ضروری ہے کہ تراویح کے مسئلہ میں تو احناف کے متدل حدیث بالا پر ورق کے ورق سیاہ کرتے ہیں کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ سخت ضعیف ہے اس سند کو پیش کرنا بدنامی اور حماقت ہے۔ مگر نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے ثبوت میں مشہور غیر مقلد حکیم محمد صادق سیالکوٹی نے اپنی کتاب صلوۃ الرسول کے صفحہ ۳۳۳ پر اسی راوی کی روایت بحوالہ ابن ماجہ پیش کی ہے۔ وعن ابن عباس ان النبی قرا علی الجنائزہ بفاتحة الكتاب (ابن ماجہ) کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی ہے۔

اور ابن ماجہ میں اس روایت کی سند یوں ہے حدثنا احمد بن منیع ثنا زید بن الحباب ثنا ابراہیم بن عثمان عن الحكم عن مقسم عن ابن عباس ان النبی قرا علی الجنائزہ بفاتحة الكتاب (ابن ماجہ ص ۱۰۷)

گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوگا کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ضعیف راوی نہیں لیکن اگر ان محدثین کی بات مان لی جائے تو بعض کے توثیق اور بعض کی تضعیف سے اس کو مختلف فیہ راوی مان لیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے مقدمہ ثانیہ میں ذکر کیا کہ ایک ضعیف روایت تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابل استدلال اور صحیح قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی اس

روایت کو امت مسلمہ نے معمول بھا کر دیا ہے اور دو صحابہ سے لے کر آج تک اسی روایت پر عمل ہوتا رہا ہے اور بیس رکعات تراویح کا عمل خیر القرون سے آج تک منقول و مشاہد ہے خلفاء راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اقوال و افعال اور فتاویٰ اس روایت کے مؤید ہیں ہم نے مقدمہ ثالثہ میں یہی ذکر کیا ہے کہ ایک حدیث ضعیف سند کے باوجود قرآن شرع کی تائید سے صحیح اور قابل احتجاج بن جاتا ہے اور یہاں پر قرآن شرع یعنی اجماع صحابہ تعالیٰ امت اور ان کا اتفاق عمل اس روایت کے مؤید ہیں ذیل میں بعض آثار اور تائید قرآن ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ مزید وضاحت ہو سکے۔

دور فاروقی: امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں باقاعدہ طور پر نماز تراویح باجماعت کا اہتمام کیا گیا اور اس وقت سے لوگوں نے باقاعدہ طور پر بیس رکعت تراویح کا اہتمام کرنا شروع کیا۔

(۱) چنانچہ حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں: کنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب بعشرین رکعة و الوتر۔ حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔ (معرفۃ السنن للبیہقی ص ۳۶۷) اس روایت کی سند پر امام نوویؒ کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے (شرح المحذب) علامہ سبکیؒ علامہ جلال سیوطیؒ ملا علی قاری رحمہم اللہ نے بھی اسکی سند کی تصحیح کی ہے۔

(۲) اسی طرح یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ان عمر بن الخطاب امر رجلاً یصلی بہم عشرین رکعة بیشک حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھائے۔

(۳) اسی طرح یزید بن رومان سے مروی ہے کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة (موطا امام مالک ص ۴۰) کہ لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں رمضان میں بیس (۲۰) رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔

(۴) عن الحسن ان عمر بن الخطاب جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلی بہم عشرین رکعة حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا اور وہ لوگوں کو بیس رکعت تراویح پڑھاتے تھے۔

(۵) عن ابی بن کعب ان عمر بن الخطاب امره ان یصلی باللیل فی رمضان فصلی بہم عشرین رکعة (کنز العمال ۲۶۴/۸) حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ بیشک حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں رات کو (تراویح) پڑھائے اس لئے اس نے لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے بیس رکعت پڑھانے کی تحقیق کے ثبوت کے بارے میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ

فرماتے ہیں قد ثبت ان ابی بن کعب کان یقوم بالناس عشرين رکعة ویوتر بثلاث فرای اکثر من العلماء ان ذالک هو السنة لامة قام بین المهاجرین والانصار ولم ینکره منکر (فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۱۲/۳)

یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے اس لئے علماء کی اکثریت کی رائے میں بیس ہی سنت ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے مهاجرین اور انصار (بیس رکعت پڑھتے تھے) اور کسی منکر نے بھی انکار نہیں کیا۔

دور عثمانی: حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ عہد فاروقی میں لوگ بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اور لوگ لمبے قیام کی وجہ سے لاکھوں پر سہارا لیتے تھے (السنن الکبریٰ ۲/۲۹۲) اسی طرح علامہ عینیؒ نے لکھا ہے وفی روایۃ له (سائب بن یزید) وعلی عہد عثمان وعلیؓ مثله (البدایہ ۳/۱۰۱) کہ حضرت سائب بن یزید سے روایت کہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی لوگ بیس رکعات پڑھتے تھے دور فاروقی کی طرح عہد عثمانی میں بھی کسی نے بیس رکعت تراویح پر تنقید نہیں کی اور نہ اس کو بدعت کہا ہے گویا اس دور میں سب مسلمانوں کا بیس رکعات تراویح پر اتفاق رہا۔

دور مرتضوی: اسی طرح دور مرتضوی (حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت) میں بھی اسی پر موافقت رہا، حضرت علیؓ نے خود قرآن کو بیس رکعت تراویح پڑھانے پر مامور فرمایا تھا۔ ۱۔ عن ابی عبد الرحمن

السلمی عن علی قال دعا القراء فی رمضان فامر منهم رجلاً یصلی بالناس عشرين رکعة وکان علی یوتر بهم (سنن کبریٰ للبیہقی ۲/۲۹۶) کہ حضرت علیؓ نے قاریوں کو بلایا اور ان میں سے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھایا کرے اور خود حضرت علیؓ لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔

(۲) عن ابی الحسن ان علیاً امر رجلاً یصلی بهم فی رمضان عشرين رکعة۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۳۹۳) ابوحسن سے روایت ہے کہ بیشک حضرت علیؓ نے ایک آدمی کو مامور کیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

دیگر صحابہ کرام و تابعین کا عمل: دور خلفاء ثلاثہ کے علاوہ بعد کے ادوار میں بھی تقریباً جمیع صحابہ کرام کا بیس رکعت پڑھنے کا عمل تھا۔ چنانچہ امام حسن بصریؒ عبد العزیز بن رافع سے روایت کرتے ہیں:

۱۔ کان ابی بن کعب یصلی بالناس فی رمضان بالمدينة بعشرين رکعة ویوتر بثلاث (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۸۵) ”کہ ابی بن کعبؓ مدینہ منورہ میں رمضان

مبارک میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین رکعت وتر پڑھایا کرتے تھے۔“

۲۔ عن عطاء قال ادركت الناس وهم يصلون ثلاثا وعشرين ركعة بالوتر (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۲۹۳) ”حضرت عطاء بن ابی رباحؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے پایا ہے۔“ اس روایت میں الناس سے مراد صحابہ کرام اور تابعین ہیں۔

۳۔ ابو حنیفہ عن حماد عن ابراہیم ان الناس كانوا يصلون خمس ترويحاً فی رمضان (کتاب الآثار لابن یوسف ۴) ”ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ سب لوگ (تابعین و تبع تابعین) رمضان میں بیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔“

ان آثار اور تعامل کے علاوہ مزید روایات و آثار کے لئے مصنف ابن ابی شیبہ، قیام اللیل، سنن کبریٰ للبخاری اور آثار السنن مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلئے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے صحابہ کرامؓ کے آثار کتب حدیث میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں: قلت والآثار فی الباب اکثر من ان تحصی (اوجز المسالك ۲/۵۳۵) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں اتنے آثار ہیں جو گنے نہیں جاسکتے (یعنی بہت زیادہ ہیں)

اجماعی ثبوت: اور اسی پر صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے: والیہ ذهب من التابعین ابن ابی ملیکۃ، وعطاء وابو البختری والحارث الهمدانی وسعید بن ابی الحسن، اخو الحسن البصری وعبد الرحمن بن ابی بکر وغیرہم قال ابن عبد البر وهو قول جمهور العلماء وبة قال الکوفیون والشافعی واكثر الفقهاء وهو الصحيح عن ابی بن کعب من غیر خلاف من الصحابة (بحوالہ معارف السنن ۵/۵۴۲)

عشر بیس تراویح کی طرف تابعین میں سے ابن ابی ملیکہ، عطاء بن ابی رباحؓ، ابو الخثری، حارث سعید بن ابی الحسن، اخو الحسن البصری، عبد الرحمن بن ابی بکر اور دوسرے حضرات گئے ہیں علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی رائے کوفیوں، امام شافعیؒ اور اکثر فقہاء کرام کی ہے، حضرت ابی بن کعبؓ سے یہی صحیح طریقے سے نقل ہے اور اس میں کسی بھی صحابی سے اختلاف مروی نہیں اور علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: ان عمر جمع اصحاب

رسول اللہ ﷺ فی شهر رمضان علی ابی بن کعب فصلی بهم کل لیلة عشرين ركعة ولم ينكر عليه احد فيكون اجماعاً منهم علی ذلك - ابن قدامة نے المغنی کے ۱/۸۰۲ پر لکھا ہے کہ وهذا كما لا جاع (بحوالہ معارف السنن ۵/۵۴۳) بیشک حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کو رمضان المبارک کے مہینے میں حضرات ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا اور آپؐ نے ان کو

ہر رات بیس رکعت تراویح پڑھایا کرتے تھے اور کسی اس پر تکبر نہیں کی، گویا اسی پران کا اجماع ہوا، علامہ ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ (صحابہ کرام کا تکبر نہ کرنا) اجماع کی طرح ہے۔

اسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا الدسوقی علی الشرح الکبیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: وہی ثلاث وعشرون رکعة بالشفح والوتر كما كان عليه عمل الصحابة والتابعين وجرى عليه العمل سلفاً وخلفاً (اوجز المسالك ۵۳۴/۲)

میں رکعات تراویح دو رکعت کے ساتھ اور تین رکعات وتر پر صحابہ کرام تابعین کا عمل رہا اور اسی پر سلفا و خلفا عمل ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اجمع الصحابة على ان التراويح عشرون ركعة (مرقات ۱۹۴/۳) صحابہ کرامؓ کا بیس رکعات پر اجماع تھا۔

صاحب اتحاف سادة المتقين فرماتے ہیں: وبلاجماع الذي وقع في زمن عمرؓ اخذ ابو حنيفة والثوري والشافعي واحمد والجمهور واختبار ابن عبد البر (اتحاف سادة المتقين ۴۲۲/۳) بیس رکعات تراویح جو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اجماعاً ثابت ہے اسی کو امام ابو حنیفہؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور نے لیا ہے اور اسی کو حافظ ابن عبد البرؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔

مذہب اربعہ: جس طرح صحابہ کرام تابعین اور تبع تابعین کا بیس رکعات تراویح پر اتفاق تھا۔ اسی طرح مذہب اربعہ میں بھی یہ مسئلہ اتفاقی ہے، کسی بھی مذہب کے امام نے آٹھ تراویح کا قول نہیں کیا۔

۱۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں لکھا ہے: واختلف اهل العلم في قيام رمضان فرأى بعضهم ان يصلي احدى واربعين ركعة مع الوتر وهو قول اهل المدينة والعمل على هذا عندهم بالمدينة واكثر اهل العلم على ما روى عن علي وعمر وغيرهما من اصحاب النبيؐ عشرين ركعة وهو قول سفیان الثوري وابن المبارك والشافعي وقال الشافعي وهكذا ادرکت ببلدنا بمكة يصلون عشرين ركعة وقال احمد روى في هنا الوان لم ينص فيه بشئ وقال اسحاق بن نختار احدى واربعين ركعة على ما روى عن ابي بن كعب۔ (جامع ترمذی ۱۱۲/۱)

رمضان المبارک کے مہینے میں قیام کا مسئلہ اہل علم کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض اہل علم وتر کے ساتھ اکتالیس رکعات کے قائل ہیں اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے اور اسی پران کا عمل ہے، اور اکثر اہل علم بیس رکعت کے قائل ہیں اور یہ رائے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام مثلاً حضرت علیؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مرویات کے موافق ہے، اور

یہی سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور امام شافعی کا قول ہے۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ میں بیس رکعات پڑھتے دیکھا ہے۔ اور امام احمد حنبل کا کہنا ہے کہ تراویح میں مختلف روایات میں (بیس سے لے کر اکتالیس تک) اسی پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ اور امام اسحاق فرماتے ہیں کہ ہم اکتالیس رکعت کو اختیار کرتے ہیں اور یہی حضرت ابی بن کعب کی روایت کے موافق ہے، امام ترمذی کی عبارت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ صحابہ تابعین ان تبع تابعین کے زمانہ میں کہیں بھی کوئی جماعت با فرد مشہور آٹھ رکعت تراویح کا قائل نہیں تھا۔ ورنہ امام ترمذی اس کا تذکرہ ضرور کرتے، ان کا ذکر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان ادوار میں آٹھ رکعات تراویح کا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ اور نہ لوگ آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے۔

اسی لئے علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں: ولم يقل احد من الائمة الاربعة باقل من عشرين ركعة في التراويح واليه جمهور الصحابة رضوان الله عنهم. (العرف الهدي ۱/۱۶۶) ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی بیس رکعات تراویح سے کم کے متعلق نہیں کہا ہے، اور یہی عمل جمہور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔

جب ان دلائل شرع کی تائید اس روایت کو حاصل ہے تو یہ اس بات کی بالکل واضح دلیل ہے کہ جس روایت کو اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ اعتراض غلط اور صحیح نہیں ہے بلکہ وہ درست اور قابل استدلال حدیث ہے۔ اس لئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا فرماتے ہیں: لاشك في ان تحديد التراويح في عشرين ركعة لم يثبت مرفوعاً عن النبي بطريق صحيح على اصول المحدثين وما ورد فيه من رواية ابن عباس متكلم فيها على اصولهم لكن مع هذا لا يمكن الابتكار عن ثبوته بفعل عمر وسكوت الصحابة على ذلك واجماعهم على قبوله بمنزلة النص على ان له اصلاً عندهم (اوجز المسالك ۲/۵۳۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیس رکعات تراویح آنحضرت ﷺ سے محدثین کے اصول کے مطابق مرفوعاً صحیح طریقے سے ثابت نہیں اور جو روایت (بیس رکعات) کی عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے، محدثین کے اصول کے مطابق متکلم فیہا ہے۔ لیکن اس کے ثبوت سے انکار کرنا حضرت عمرؓ کے فعل اور صحابہ کرامؓ کے سکوت سے ممکن نہیں ان کا حضرت عمرؓ کے فعل کو قبول کرنے پر اتفاق کرنا نص کی طرح ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں اس فعل (بیس رکعات کی تراویح) کے لئے اصل موجود ہے۔ اور یہی بات علامہ انور شاہ کشمیری صاحب فتاویٰ تاتاریخانیہ کے حوالہ سے نقل کر کے فرماتے ہیں:

ففي التاتاريخانية: سأل أبو يوسف إبا حنيفة ابن اعلان عمر بعشرين

رکعت ہل کان لہ عہد منہ ﷺ قال ابو حنیفہ ما کان عمر مبتدعاً ای لعلہ یکون لہ عہد فذل علی ان عشرین رکعت لا بد من ان یکون لها اصل منہ ﷺ وان لم یبلغنا بالاسناد القوی۔ (العرف الشذی ۱/۱۶۶)

تاتارخانیہ میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ حضرت عمرؓ کے بیس رکعات کے اعلان کے لئے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کوئی اصل ہے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ بدعتی نہیں تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیس رکعات تراویح کے لئے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اصل موجود ہے اگرچہ وہ ہم تک قوی سند کے ساتھ نہیں پہنچا ہے۔ جب یہ بیس رکعات تراویح کا ثبوت آنحضرت ﷺ سے بنفس نفیس ثابت ہوا۔ جمیع صحابہ کرام تابعین تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین سلفاً و خلفاً اسی پر عمل کرتے چلے آ رہے ہیں تو اس کے بعد آٹھ رکعت کا قائل ہونا بیس رکعات کو بدعت اور ناجائز کہنا خرق لہلہا جماع ہے۔ چنانچہ علامہ بخاریؒ لکھتے ہیں وبالجملۃ: العشرین من التراویح وثلاث الوتر هو الذی استقر علیہ الامر اخیراً کما یقولہ الشعرانی فی کشف الغمۃ والمیوٹی فی المصابیح فمن احدث خلافاً بعد هذا الاتفاق یکون خارقاً للاجماع (معارف السنن ۵/۵۳۶)

بیس رکعات تراویح اور تین و تر پر اخیر میں استقرار (دوام) ہوا جیسا کہ علامہ شعرانیؒ نے کشف الغمۃ اور علامہ سیوطیؒ نے المصابیح میں لکھا ہے پس جس کسی نے بھی اس اتفاق کے خلاف کہا تو اس نے اجماع کو پامال کیا۔ جب کسی روایت کو صحابہ کرام کے اجماع خلفاء راشدین کا تعامل، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اور اجماع امت کا تعاون حاصل ہو تو پھر بھی صرف ایک فرد کی وجہ سے اور وہ بھی اس وجہ سے جو حقیقتاً سبب جرح بھی نہیں پورے کو ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دینا انصاف نہیں۔

احناف کی بعض کتابوں کے بحوالہ جات کا جواب: اور جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمائے ہیں ان کے بارے میں لکھنے سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں درج شدہ جزئیات میں سے صرف ان جزئیات کا اعتبار کیا جاتا ہے جو فقہاء امت کے ہاں رائج ہوں یا ان کا تعلق ظاہر الروایۃ سے ہوں اس لئے جو جزئیات ان دونوں میں سے الگ ہوں تو وہ فقہ حنفی شمار نہیں ہوگا اس لئے اگر کسی حنفی عالم نے اس قسم کی کوئی بات لکھی دی ہو وہ اس کا تفرّد اور ذاتی رائے شمار ہوتی ہے فقہ حنفی شمار نہیں ہوگی۔ محقق العصر علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اپنے منظوم کلام میں لکھا ہے۔

لہذا اس اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں پیش کئے ہیں۔ وہ ان حضرات کی یا تو ذاتی رائے ہے اور یا انہوں نے کسی سے روایت نقل کی ہے اور آنجناب نے اس مقام کو سمجھنے کی سعی

نہیں فرمائی۔ کہ آیا واقعی یہ اس مصنف کا قول ہے بھی جس کا خط میں حوالہ دیا جا رہا ہے، اور یہ قول اس مذہب خفی میں رہتے ہوئے کہی ہے۔ یا اس نے کسی کا حوالہ یا روایت نقل کی ہے۔

آنجناب نے کتاب الآثار کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے آٹھ رکعت تراویح پڑھی تھی، اور نہ اس میں رمضان کا ذکر ہے، اس لئے اسکو تراویح کی تعداد پیش کرنا نامناسب ہے۔ اس روایت کو امام محمدؒ نے باب الصلوۃ قطوعاً میں ذکر کیا ہے اس سے مراد قیام اللیل یعنی تہجد ہے جو رمضان وغیرہ رمضان دونوں میں جائز اور مستحب ہے۔

### ضروری تنبیہ:

۱۔ اگر آنجناب نے اس روایت سے استدلال اس لئے کیا ہے کہ اس میں لفظ کان ذکر ہے اور کان دوام اور استقرار کے معنی میں آتا ہے تو مقصد یہ ہوا کہ یہ اس سے مراد صلوۃ تراویح ہے اور آنحضرت ﷺ نے رمضان میں بھی آٹھ رکعات پڑھا کرتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ کان عموماً اور کلیۃً استقرار کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ موقع اور محل کے اعتبار سے اس میں دوام پایا جاتا ہے ہر وقت دوام کے لئے نہیں ورنہ پھر اس روایت کے متصل روایت کہ کان عبد اللہ بن عمرؓ یرضی التطوع علی راحلتہ کا معنی ہوگا کہ عبد اللہ بن عمرؓ ہمیشہ نفل سواری کے اوپر پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ آپؐ عموماً ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کیفیت آپؐ کی صرف حالت سفر میں ہوتی تھی کہ آپؐ سواری کے اوپر نفل پڑھتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ کان عموماً دوام کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اس کے اور بھی نظائر موجود ہیں جہاں لفظ کان مضارع پر داخل ہوا مگر وہاں کسی نے دوام کا معنی نہیں لیا۔

۲۔ اسی طرح دوسرا جواب یہ ہے کہ آنجناب نے جو عبارت امام محمدؒ کی کتاب الموطا کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ دراصل حضرت عائشہؓ کی روایت کا حصہ ہے، امام محمدؒ کا اپنا قول نہیں اور حضرت عائشہؓ کی روایت تہجد کی نماز پر محمول ہے۔

۳۔ اسی طرح امام ابن ہمامؒ کے حوالہ سے جو بات مکتوب میں نقل کی گئی ہے تو وہ ابن ہمامؒ کا اپنا اجتہاد اور تفرد ہے اس کو علماء احناف نے قبول نہیں کیا ہے، اور میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ فقہ خفی میں مذہب کے حوالہ سے انفرادی رائے قبول نہیں ہوتی۔ اور ابن ہمامؒ کے تفردات کے بارے میں ان کے شاگرد علامہ قاسم بن قطلوبغا فرماتے ہیں۔ تفردات شیخنا لا تقبل کہ میرے شیخ تفردات مقبول نہیں اس لئے اس کو فقہ خفی پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ اسی طرح آنجناب نے جو حوالہ عمدۃ القاری کا دیا ہے اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ یہ احناف کثر اللہ سواد ہم یا خود علامہ عینیؒ کی رائے اور فتویٰ ہے، بلکہ علامہ صاحب تو تفصیلی بحث میں آنجناب کے حوالہ کے خلاف فرماتے ہیں

وقیل عشرون وحکاه الترمذی عن اکثر اہل العلم فانہ روی عن عمرو علی

وغیرہما من الصحابة وهو اصحابنا الحنفیة (عمدۃ القاری ۱۱/۱۲۶)

تراویح کی تعداد کے بارے میں ایک رائے بیس رکعت کی ہے۔ اور اسی کو امام ترمذیؒ نے اکثر اہل العلم سے نقل کیا ہے اسی طرح حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے مروی ہے اور یہی ہمارے احناف کی رائے ہے۔

آنجناب نے کیسے آٹھ رکعت کی نسبت علماء احناف کی طرف کردی۔ اور اس کو علامہ عینیؒ کا قول اور رائے

قرار دیا گیا۔

۵۔ اسی طرح یہی حال ملا علی قاریؒ کے مرقات کے حوالہ کی ہے، اگرچہ اختلاف فی المسئلہ کے بیان میں انہوں نے آٹھ کا ذکر کیا ہے، لیکن وہاں یہ بھی فرماتے ہیں۔ لکن اجمع الصحابة علی أن التراويح عشرون ركعة (مرقات ۳/۲۸۲) کہ بیس رکعت تراویح پر تمام صحابہ کرام متفق ہو چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکتوب میں درج شدہ حوالہ کی عبارت ملا علی قاریؒ کا فتویٰ یا رائے نہیں۔

۶۔ اسی طرح آنجناب نے علامہ عبدالحیؒ کے التعلیق المجدد کا حوالہ دیا ہے، اس حوالے کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے بناء بر حکایت حدیث ۱۱ رکعات نقل کی ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ علامہ کی رائے ہے بلکہ علامہ صاحب دونوں طرح کی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ان لا شک فی صحة حدیث عائشة وضعف حدیث ابن عباس لکن الاخذ بالراجح وترك المرجوح انما يتعين اذا تعارضتا تعارضاً لا يمكن الجمع وهلنا الجمع ممكن بأن يحمل حدیث عائشة علی انه اخبار عن حالة الغالب كما صرح به الباجی فی شرح الموطا وغیره ويحمل حدیث ابن عباس علی انه كان ذلك احياناً (التعلیق المجدد علی الموطا للإمام محمد/۱/۶۲۱)

حضرت عائشہؓ کی روایت کی صحت اور ابن عباسؓ کی روایت کی ضعف میں کوئی شک نہیں لیکن رائج کو لینے اور مرجوح کو ترک کرنے کا سوال تب پیدا ہوگا جب دونوں میں ایسا تعارض ہو کہ دونوں کا جمع کرنا ممکن ہی نہ ہو، اور یہاں جمع کرنا ممکن ہے وہ اس طرح کہ حضرت عائشہؓ کی روایت غالب احوال کے متعلق ہے جیسا کہ علامہ بابیؒ نے موطا کی شرح وغیرہ میں لکھا ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت احياناً کے متعلق ہے۔

بلکہ علامہ صاحب اپنی دوسری تصنیف میں فرماتے ہیں: قلت اكتفاء النبي ﷺ على ثمان ركعات في التهجيد، لو ثبت انه لم يزد عليه شيئاً في وقت ما، ليس من قبيل التحديد الالتزامي، بحيث لا يجوز الزيادة عليه فكيف وقد قال النبي ﷺ الصلاة خير موضوع فمن شاء فليقل ومن شاء فليستكثر فلما جازت الزيادة وواظب على الزيادة الخلفاء كانت سنة بالنسبة إلينا لا ملزوم سنتهم (تحفة الاخبار باحياء السيرة الاربار - ص ۱۲۷)

میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا آٹھ رکعات پر اکتفاء کرنا تجدد میں تھا، البتہ اگر ثابت ہو جائے کہ

آنحضرت ﷺ نے (رمضان میں) آٹھ رکعات پر کسی بھی وقت زیادتی نہیں کی تو یہ تحدید التزامی نہیں جس پر زیادتی جائز نہ ہو اور یہ عدم جواز کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تو فرمایا ہے کہ نماز بہترین عمل ہے جو چاہیے اس میں کمی کرے اور جو چاہیے زیادہ پڑھے۔ جب نماز کی تعداد رکعات میں زیادتی جائز ہے اور خلفاء راشدین نے (رمضان میں) اس پر زیادتی کرتے بیس رکعات (پر مواخبت کی تو ہمارے لئے خلفاء راشدین کی تعداد سنت ہے اس لئے کہ ان کی سنت پر عمل کرنے کے لزوم کا حکم ہو چکا ہے۔

اور حدیث ابن عباس پر بحث کرتے ہوئے خود علامہ صاحب فرماتے ہیں۔

لا يقال هذا حديث غير مقبول كما صرح به ائمة الفتن على ما سبق ذكره لانا نقول لم يصرح احد منهم بانه موضوع بلى غاية ما قيل انه حديث منكر والمنكر ليس من اقسام الموضوع بل هو من اقسام الضعيف وليس كل ضعيف ولاكل منكر كالموضوع الذي لا يحل نقله والتأييد به (تحفة الاخبار باحياء سيد الابرار ص ۱۲۷)

اور نہ یہ کہا جائے کہ یہ حدیث مقبول نہیں جیسا کہ ائمہ الفتن نے تصریح کی ہے جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی اس روایت کو موضوع نہیں کہا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ انہوں نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اور منکر موضوع کے اقسام میں سے نہیں بلکہ منکر ضعیف کے اقسام میں سے ہے اور نہ ہر ضعیف موضوع کے مانند ہے اور نہ ہر منکر جن کا نقل اور ان سے تائید حاصل کرنا جائز نہیں ہو۔

علامہ صاحب کے مذکورہ بالا عبارات اور تصریحات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ علامہ صاحب نہ خود آٹھ رکعات تراویح کے قائل ہے اور نہ وہ آٹھ رکعات احناف کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ہدایت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ آٹھ رکعت پڑھنے والا سنت موکدہ کا تارک ہے (حاشیہ ہدایہ ۱۰۱/۱)

۷۔ اسی طرح یہی حال آنجناب کے العرف الشذی کے حوالہ کا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ آٹھ رکعات کا ذکر العرف الشذی میں کیا ہے مگر اس میں یہ کہیں نہیں کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذاتی رائے یا انہوں نے اس کو احناف کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو آٹھ رکعات پر اکتفا کرنے والوں کو سخت الفاظ سے یاد فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: واما من اكتفى بالركعات الثمانية وشذ عن السواد الاعظم وجعل ترميمه بالبدعة فليرعاقبته (فيض الباری ۱۸۱/۳)

کہ جو آٹھ رکعات پر اکتفا کرتا ہے تو گویا اس نے سواد اعظم سے علیحدگی اختیار کی اور جو ان کو (بیس رکعات تراویح کے قائلین) کو بدعتی کہتے ہیں وہ اپنی عاقبت (انجام) کو دیکھ لے۔

علیٰ هذا القياس یہی حال ان حوالہ جات کا بھی ہے جو آنجناب نے مکتوب میں احناف کا مذہب ظاہر کرتے ہوئے تحریر

فرمائی ہے ان میں سے کوئی بھی ذاتی طور پر اور مذہباً آٹھ رکعات تراویح کا قائل ہے اور اگر بالفرض کوئی ہو بھی تو وہ اس کی ذاتی انفرادی رائے ہوگی مذہب کیساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں؛ انکی ذاتی رائے کو ہم جمہور کی رائے اور ترجیح کے مقابل بلا ضرورت نہیں قبول کر سکتے، ان وضاحتوں کے باوجود یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ کتاب میں کسی عبارت کو نقل کرنے اور اپنے مذہب کے خلاف قول کی حکایت کرنے سے یہ ہرگز لازم نہیں کہ یہ رائے ناقل کی ذاتی یا اس کے مسلک کا مفتی بہ قول ہے۔ ورنہ اگر کسی قول کا نقل کرنا ناقل کی ذاتی رائے یا مذہب تصور کیا جانا صحیح ہو پھر تو غیر مقلدین حضرات کی کتابوں میں اس قسم کے اقوال و آراء بہت سارے ہیں جو ان کی رائے کے خلاف ہیں و علی القیاس۔

اس لئے یہ واضح ہو کہ آٹھ رکعات تراویح نہ صحابہ کرامؓ کا مذہب رہا ہے اور نہ اسلام و اخلاف کا اور نہ مذاہب اربعہ میں سے کوئی آٹھ رکعات کا قائل ہے۔ بلکہ یہ آٹھ رکعات تہجد کی نماز ہے جو آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھا کرتے تھے اگر اس کو تراویح قرار دیا ہے تو تراویح تو صرف رمضان میں ہوا کرتی ہے، غیر رمضان میں نہیں ہوتی جبکہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں رمضان اور غیر رمضان دونوں میں آٹھ رکعات کا ذکر ہے۔ حضرت عائشہؓ کی یہی تصریح واضح کرتی ہے کہ اس روایت کا تعلق قیام اللیل (تہجد) کے ساتھ ہے۔ اور تراویح الگ نماز جس کی تعداد آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک سے جو بروایت عبداللہ بن عباس ذکر ہوا اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرامؓ تابعین کے تعامل سے بیس رکعات ثابت ہے۔

آخر میں اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق بات سمجھنے، حق بولنے، اور حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو تعصب، عناد اور زلیغ و ضلال سے محفوظ و مامون رکھے۔ (امین) اس کے علاوہ الفاظ، تعبیر اور تحریر کی غلطی کا معذرت خواں ہوں۔

وصوالہ موافق

(مفتی) ابو طلحہ مختار اللہ حقانی

خادم دارالافتاء والد ریس بجامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

**نوٹ**

قارئین : ایڈیٹر ”الحق“ کانیا ای میل ایڈریس نوٹ فرمائیں:

Email : editor\_alhaq@yahoo.com

© rasailojaraid.com